دستِ شفاء

سُندس جبین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تیرا خیال بہت دیر تک نہیں رہتا
کوئی ملال بہت دیر تک نہیں رہتا
اداس کرتی ہے اکثر تمہاری یاد مجھے
مگر یہ حال بہت دیر تک نہیں رہتا

''نقوی ولا'' میں ایک وحشت ناک خاموشی تھی' ناشتے کی میز پہ آج خلاف معمول کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سب ہی اپنے اپنے کمروں میں بند تھے' پھر ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے سید حیدر نقوی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ خاموشی سے اپنے گلاسز اور موبائل لے کر لاؤنج کراس کرتے بیرونی دروازے کے قریب پہنچ کر رکے' چند لمحے کچھ سوچا اور پھر واپس پلٹ آئے' اب ان کا رخ ماما کے کمرے کی طرف تھا۔

دروازے پر چند لمحے وہ ٹھہرے پھر ہلکا سا دروازہ تھپتھپایا۔ جس کا کوئی جواب نہ آیا انہوں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں تاریکی تھی' دروازہ کھلنے پر روشنی کی ایک لمبی لکیر سی اندر تک گئی۔ وہ اندر جانے کی بجائے وہیں کھڑے رہے۔ وہ ایزی چیئر پر جھول رہی تھیں اور روشنی کی وہ لکیر ان کے قدموں تک پہنچ کر ختم ہوگئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی کرسی کی حرکت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

''ماما......!'' انہوں نے ماں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا' حالانکہ آج تک یہ چیز بن مانگے سب سے پہلے ان کا مقدر ٹھہری تھی۔ مگر اب جب وہ طالب تھے تو انہوں نے اس کی طرف نہ دیکھا۔

''میں جانتا ہوں' آپ مجھ سے ناراض ہیں' میری طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میری جگہ آ کر سوچیں' ایسا کہنے کی ضرورت تو تب پیش آتی ہے جب ہمیں لگتا ہے کہ دوسرا ہمارے احساسات کو سمجھ نہیں پارہا۔ آپ تو ماں ہیں' آپ احساسات وجذبات کو تب بھی سمجھ جاتی تھیں جب میں زبان سے بیان کرنے سے قاصر تھا' آپ ضروریات سے تب واقف تھیں جب اشاروں سے بھی میں حاجت بیان کرنے کے قابل نہ تھا۔ اب بیان کرکے میں اس پاک رشتے کی توہین نہیں کرسکتا۔ میں صرف آپ سے اپنے خیالات شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے ہمیشہ میرا خیال رکھا' میری پسند ناپسند کو اولین ترجیح دی۔ میری بہترین تربیت کی' لوگوں کے اس ہجوم میں مجھے انسان بنایا' ایک باضمیر' احساس مند' ہمدرد اور روشن خیال انسان' مجھے دولت اور خوب صورتی متاثر نہیں کرتی' کیونکہ مجھے تراشنے والے ہاتھ سطحی نہیں ہیں۔ مجھے کردار متاثر کرتا ہے' مجھے علم جھکا سکتا ہے' اس کے علاوہ مجھے کوئی چیز جھکالے یہ ممکن نہیں' میرا احساس میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ میرا ذوق' میری پاکیزگی' میری ذاتی تکریم پر کوئی شب خون مارے اور میں سہہ جاؤں؟ میری آپ سے صرف ایک ریکویسٹ ہے' مجھے آپ کا عکس چاہیے' بلند کردار اور وسیع النظر' اور اگر آپ کو لگتا ہے کہ وہ جسے آپ نے میرے لیے منتخب کیا ہے اس میں آپ کی پرچھائیں بھی موجود ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ اپنی بات مکمل کرکے لمحہ بھر کے لئے رکے مگر وہاں ہنوز خاموشی تھی۔ انہوں نے آہستگی سے قدم پیچھے ہٹائے اور دروازہ بند کردیا۔

روشنی کی وہ لمبی سی لکیر غائب ہوگئی مگر اب کرسی کی حرکت رک چکی تھی۔

❁......❁......❁

Row `row row you boat
Gently down the stream,

Merely merely merely

Life is but adream.

ماما نے اس معصوم آواز پر تیزی سے کچن سے نکل کر اندر جھانکا...... وہ چار سالہ حیدر تھا۔ ان کا بڑا بیٹا...... جو کہ اس وقت بہت اہتمام سے اپنی چھوٹی چیئر پر بیٹھا سامنے رکھے ٹیبل کو خود ساختہ آرکسٹرا کا روپ دیئے مدھم انداز میں اس پر انگلیاں چلاتے ہوئے بڑی خوب صورت آواز میں گنگنا رہا تھا۔ چند لمحے وہ حیران سی وہیں کھڑی رہیں۔ یہ نظم تو انہوں نے کل ہی سکھائی تھی اسے اور آج وہ اسے گا رہا تھا۔ وہ بھی بالکل اسی طرز پر اور مستزاد اس کا وہ دلکش انداز...... وہ بے ساختہ آگے بڑھیں اور اس کو بازوؤں میں بھینچ کر ماتھے پر بوسہ لے لیا تھا۔ وہ جان گئی تھیں ان کا بیٹا یقیناً عام بچوں سے بہت مختلف تھا۔

وہ تین سال کی عمر میں اسکول جانے لگا اور روایتی بچوں کی طرح کبھی بھی اسکول جاتے ہوئے کسی قسم کی بے زاری یا رونا پیٹنا نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت خوش خوش اسکول جاتا تھا۔ کتابیں، کاپیاں ایسی نیٹ اینڈ کلین کہ یقین نہ آتا۔ پینسل پکڑنے کا انداز اتنا پیارا کہ ماما بے ساختہ ہاتھ چوما کرتیں۔

''میرے بیٹے کو کتابوں سے عشق ہے۔ دیکھنا ایک دن روشن ستارہ بنے گا۔'' وہ بڑے یقین سے کہا کرتی تھیں۔ اور حیرت انگیز طور پر ان کے باقی دو بچے عام بچوں جیسے ہی تھے۔

سید حیدر نقوی ان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے بعد فرقان نقوی اور اس کے بعد سیدہ ماہا نقوی۔

❀......❀......❀

''پیارے دوستو!

آج مجھے جس موضوع پر لب کشائی کا موقع دیا گیا ہے اس کا عنوان ہے''ماں''

کس قدر میٹھا لفظ ہے یہ 'ماں' جسے ادا کرتے ہوئے ہونٹ خود بخود مل جاتے ہیں۔ ماں کی محبت لازوال ہے یہاں تک کہ عرش پر جانے والی کوئی بھی دعا جو ماں کے لبوں سے ادا ہو وہ رد نہیں کی جاتی۔ ماں کی محبت کس قدر خالص ہے اس کا اندازہ اس ارشاد سے لگایا جاسکتا ہے جس میں کہا گیا ہے!

''اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے''یعنی اللہ کی محبت کے برابر ماں کی محبت کو درجہ دیا گیا۔

ہمارے پیارے نبی محمد ﷺ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ انسان پر سب سے زیادہ کس کا حق ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تمہاری ماں کا'' اسی طرح سے حضرت امام حسینؓ نے فرمایا۔

''اپنی ماں کے ساتھ وقت گزارا کرو یہ قیامت کے روز نجات کا سبب ہوگا۔''

دوستو! ان ارشادات سے آپ کو ماں کے بلند رتبے کا علم ہوگیا ہوگا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ماں کی نافرمانی سے بچیں، کیونکہ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔''

روسٹرم پر مائیک کے آگے کھڑا وہ بچہ 5th کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا اور اس ساری تقریر کے دوران اس کی نظر سامنے سجی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی اپنی ماما پر تھی۔ اور جب اس تقریری مقابلے کے نتائج کا اعلان کیا گیا تو ہمیشہ کی طرح اور توقع کے مطابق سید حیدر نقوی فرسٹ تھا۔

پرائز لیتے ہوئے اس کا رنگ جوش سے سرخ پڑ رہا تھا اور تالیاں بجاتے ہوئے ماما کا سر فخر سے بلند ہوگیا تھا۔

❀......❀......❀

کلاس روم میں پن ڈراپ سائلنس تھا۔ سر سعید بٹ کا ڈسپلن تو پورے اسکول میں مشہور تھا کہ ان کی کلاس میں کوئی پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ حاضری لگا رہے تھے اور طلباء اپنے آگے کتابیں کھولے بے آواز صرف ہونٹوں کو حرکت دیتے ہوئے سبق کی دھرائی میں مشغول تھے۔ جب وہ طلباء کے نام لیتے لیتے ایک دم رک گئے۔

''سید حیدر نقوی۔'' ان کی گرجدار آواز پر پہلی رو میں بیٹھا بچہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے آہستہ آواز میں یس سر کہا تھا۔

''دو دن سے بغیر اطلاع کے آپ اسکول سے غیر حاضر رہے ہیں وجہ؟'' ان کے ماتھے پر غصیلی شکن تھی۔ حیدر نے گھبرائے بغیر بڑے آرام سے کہا۔

''سر! وہ ہم بیمار تھے۔ اور ڈاکٹر نے ہم سے کہا تھا کہ ہم دو دن آرام کریں۔ اس لیے ہم اسکول نہیں آسکے۔'' اس کے انداز میں اعتماد و معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی وجہ بتاتے ہوئے انجانے میں ہی سہی سارا زور ہم پر تھا' اور سر سعید کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''سید صاحب! ذرا یہ تو بتایئے کہ یہ ''ہم'' میں اور کون کون شامل ہے؟'' انہوں نے دلچسپی سے اس کی معصوم صورت دیکھی۔ حیدر نے قدرے الجھ کر انہیں دیکھا۔

''سر! ہم میں بس ہم شامل ہیں۔'' اس نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ایک اور قہقہہ پڑا۔

''بیٹے! ہم کا صیغہ دو یا اس سے زیادہ لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب ایک فرد کی یعنی اپنے متعلق کوئی بات کی جائے تو میں کا صیغہ استعمال ہوگا۔ جیسے میں بیمار تھا اور مجھے ڈاکٹر نے آرام کرنے کے لیے کہا...... ٹھیک ہے؟'' انہوں نے انتہائی پیار سے سمجھایا تھا۔

جس پر اس نے فرماں برداری سے سر ہلا دیا تھا۔ سر سعید نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ 7th کلاس کا یہ اسٹوڈنٹ ان کا لاڈلہ ترین اسٹوڈنٹ تھا۔ جس میں ذہانت و معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

❀......❀......❀

اہل سادات سے ہونے کی بنا پر ان کے خاندان میں ہمیشہ آپس میں شادیاں کی جاتی تھیں۔ ایسا ہی ایک خوب صورت جوڑا سید علی رضا نقوی اور سیدہ زہرہ بتول کا بھی تھا۔

علی رضا پیشے کے لحاظ سے سرکاری ملازم تھے۔ اسی طرح زہرہ کالج میں لیکچرار تھیں۔ تین بچوں حیدر' فرقان اور ماہا کے ساتھ زندگی بالکل مکمل تھی۔ علی رضا بنیادی طور پر سادہ انسان تھے۔ دنیا کی فریبیوں اور مکاریوں سے یکسر انجان اور اسی سادگی کے ہاتھوں بہت دفعہ نقصان بھی اٹھا چکے تھے مگر اس کے باوجود ان کی اچھائی کا عالم وہی تھا ہر پیار سے بات کر لینے والے کو خیر خواہ سمجھ لیتے۔ مزاجاً بھی انتہائی دھیمے اور شریف النفس انسان تھے۔

زہرہ خاتون ان کی نسبت مختلف تھیں۔ سادگی اور نیک نیتی تو ان میں بھی اسی طرح موجود تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ بہترین ماں اور گھر کی منتظم تھیں۔ بچوں کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

''نقوی ولا'' کا ماحول بڑا پرسکون' ادبی اور باہمی تعاون سے پور تھا اور یہی وجہ تھی کہ خاندان بھر میں ان کے گھر کو رشک وحسد سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ نہ تو کسی کے بچے اتنے فرماں بردار اور سلجھے ہوئے تھے اور نہ ہی ایسا مثالی ماحول کسی کو میسر تھا۔ مستزاد پڑھائی میں بھی سب سے آگے تھے۔ اسی وجہ سے ایک عجیب سا حسد خاندان بھر میں پیدا ہونا شروع ہو چکا تھا جس کے متعلق کبھی بھی زہرہ خاتون نے سوچنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ انہیں لگتا تھا یہ سب فضول اور احمقانہ باتیں تھیں' بھلا ان کی سگی بہنیں اور بھائی ان سے کیوں جیلس ہوں گے انہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ وقت نے اپنے پر کچھ مزید پھیلائے اور بچے اسکول سے نکل کر کالج میں آگئے اور زندگی کے اس مقام پر زہرہ خاتون کو اپنی زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ کرنا پڑا تھا۔

حیدر کو کالج کی اسٹڈیز کے لیے وہ لاہور بھجوانا چاہتی تھیں' اس کے پیچھے کئی وجوہات تھیں۔ جس شہر میں ان کی رہائش تھی وہاں کے کالجز سے وہ مطمئن نہ تھیں اور ان کی شدید خواہش تھی کہ حیدر کو بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم دلوائیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر حیدر کو لاہور بھجوانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی اگلی منزل ''ایف سی کالج لاہور'' تھا۔ جہاں اس نے ہاسٹل میں رہائش اختیار کرنی تھی۔

زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ لاہور ایک جہاں بلاخیز......! آج کے لاہور سے بالکل مختلف تھا۔ جن زمانوں میں انہوں نے ہاسٹل جوائن کیا' نہ تو موبائل فونز کا رواج تھا نہ سلفیز کی بیماری! انٹرنیٹ' کمپیوٹر پر استعمال کیا

جاتا تھا اور بہت کم لوگوں کو لیپ ٹاپ میسر تھا۔ لوگوں کے باہمی تعلقات اس سرد مہری کا شکار نہ تھے جو آج کل معاشرے کا لازمی حصہ بنی نظر آتی ہے نہ ہی اتنی نفسانفسی اور افراتفری نظر آتی تھی لاہور تب بڑا پرسکون اور خوش حال سا نظر آتا تھا۔ انہوں نے حیدر کو مکمل اختیار دیا تھا کہ وہ جس فیلڈ کو چاہے اپنے لیے چن لے مگر شرط یہی ہے کہ پھر اسی فیلڈ میں اپنی ماسٹرز ڈگری مکمل کرنا ہوگی اس لیے اس نے بہت سوچ سمجھ کر انگلش لٹریچر کو منتخب کیا تھا لٹریچر سے اس کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ماما نے اس کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرلیا تھا۔

لٹریچر میں انٹر اور گریجویشن مکمل کرنے کے دوران ان کی شخصیت میں مزید نکھار اور خوب صورتی آ گئی' پہلے والی معصومیت کی جگہ اب ان کے چہرے پر روشنی اور اعتماد نظر آتا تھا اور ذہین آنکھوں کی چمک مزید دوبالا ہوگئی تھی۔ ان چار سالوں نے جہاں انہیں ماں سے دوری کا درد دیا تھا وہاں اس درد پر پھاہے کے طور پر علم کا خزانہ بھی بخشا تھا۔ انہیں اپنی ذات کا عرفان دیا تھا اور ان کے انداز میں کچھ ایسا ڈویلپ ہوا تھا جو دوسروں کو خود بخود متاثر کرتا تھا۔

❀......❀......❀

''تم نے حیدر کو دیکھا ہے...... کہاں ہے؟'' نادر لقمان نے یاسر عظیم سے پوچھا تھا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے یاسر عظیم ذرا سا ہنسا۔

''مجھے پتا تو نہیں ہے وہ کہاں ہے مگر میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہوگا؟''

''کہاں؟''

''حسیناؤں کے جمگھٹے میں۔'' اب کی بار یاسر عظیم نے قہقہہ لگایا تھا۔ نادر بھی مسکرایا۔

''اسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حسینائیں خود ہی اس کے گرد جمگھٹا لگا لیتی ہیں۔'' اس نے جتایا۔

''یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے توجہ حاصل کرنے کا بظاہر بے نیاز بن جاؤ' اگنور کرو فلیٹ اسٹون' مگر درپردہ شدید خواہش کرو تو جا و روقت ملے۔'' یاسر کے لہجے میں حسد تھا۔

''کم از کم حیدر کے متعلق میں ایسی بات نہیں سوچ سکتا۔ اسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔'' نادر نے یقین سے کہا۔

''یہی تو گیم ہے پیارے...... کمپلیکس ہے اسے۔''

''کس چیز کا کمپلیکس؟ احساس کمتری کا یا احساس برتری کا؟ کمتری میں انسان خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ دوسروں سے منہ لگا سکے اور برتری میں دوسروں کو' جبکہ حیدر کے ساتھ یہ دونوں معاملات نہیں ہیں۔'' نادر نے تیکھے انداز میں کہا تو چند لمحوں کے لیے یاسر کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

''مگر پھر بھی وہ کچھ زیادہ اسپیشل بنتا ہے۔''

''اسے بننے کی کیا ضرورت؟ وہ ہے......'' نادر نے ہے پر زور دیا۔

''مگر کیوں؟'' یاسر نے احتجاج کیا۔

''کیونکہ اس کی سوچ مختلف ہے' اور پاکیزہ بھی۔ تمہارے جیسی سوچ نہیں ہے اس کی۔'' نادر نے طنز کیا۔

''اوہ کم آن...... وہ pretend (پوز) کرتا ہے۔'' یاسر سے اس کا طنز سہا نہیں گیا۔

"اسے اس کی ضرورت نہیں ہے وہ خالص اور سچا انسان ہے۔" نادر نے سختی سے اس کی بات رد کی تھی۔

دنیا بڑی عجیب ہے یہاں خاموش کو بے وقوف اور بولنے والے کو جاہل سمجھا جاتا ہے۔ کوئی امارت دکھائے تو دکھاوا' نہ دکھائے تو کنجوس' ذہانت کا مظاہرہ کرے تو حسد کرتے ہیں نہ کرے تو گھنا سمجھتے ہیں۔

کتنا سچ کہتی ہیں ماما!

"تلوار کی تو صرف ایک طرف دھار ہوتی ہے' دنیا دو دھاری تلوار کی مانند ہے' جینے نہیں دیتی' روتوں کو ہنساتی نہیں اور ہنستے کو دیکھ نہیں سکتی۔"

❀......❀......❀

گریجویشن ہونے کے بعد وہ چھٹیوں پر گھر آئے تو ایک نیا مسئلہ کھڑا تھا۔ معاملہ بہت پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا۔ نانا کی وصیت کے مطابق ان کی جائیداد ان کی بیٹیوں اور بیٹے میں مکمل اسلامی طریقے سے تقسیم ہونا تھی مگر ظہور ماموں جائیداد میں حصہ دینے سے گریزاں تھے ان کا خیال تھا کہ تینوں بہنیں اپنے گھروں میں خوش حال تھیں تو انہیں حصے کی کچھ ایسی بھی ضرورت نہ تھی۔ جبکہ دوسری طرف امینہ خالہ ہر صورت حصہ وصول کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں اپنے گھر میں توسیع کرنا تھی اور اس سلسلے میں وہ ہر صورت اپنے گھر کے ساتھ والی جگہ خریدنا چاہتی تھیں۔ زینت خالہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔

جتنا بھی اس معاملے کو سلجھانے اور سمیٹنے کی کوشش کی گئی اتنا ہی معاملہ بگڑتا گیا۔ زینت خالہ اور امینہ خالہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی صورت اپنا حصہ نہ چھوڑیں گی۔ دوسری طرف ظہور ماموں ماش کی دال کے جیسے اینٹھے ہوئے تھے جو کہ کسی صورت نرم ہونے کو تیار نہ تھے۔ پنچایت بٹھائی گئی اور نتیجتاً جائیداد کی تقسیم عمل میں آئی۔

مگر زہرہ خاتون نے یہاں بھی ایک انتہائی فراخ دلانہ فیصلہ کیا اور جائیداد میں سے اپنا حصہ امینہ خالہ کو دے دیا تا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے گھر کو وسیع کرسکیں۔

خاندان بھر میں ان کی فیاضی اور دریا دلی کی مثالیں دی جارہی تھیں جبکہ ان کا مقصد ایسا ہرگز نہ تھا وہ صرف اپنی بہن' اپنی ماں جائی کی مدد کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی سادہ دلی اور سادگی ہی تھی جو انہوں نے اپنی ذات اپنے بچوں کو چھوڑ کر اپنی بہن کو ترجیح دی تھی۔

دنیا بڑی عجیب جگہ ہے یہاں سادگی کو بے وقوفی سمجھا جاتا ہے اور پھر ہر خالص اور سادہ انسان کو بڑی بے رحمی سے بے دریغ اپنے مقاصد کے لیے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

امینہ خالہ بھی وہ باکمال فنکارہ تھیں جنہوں نے زہرہ خاتون کو بڑی مکاری سے اپنی جھوٹی مظلومیت کے جال میں پھانس کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ جس میں زینت خالہ نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے فیصلہ لے لیا اور سب نے انتہائی خوش دلی سے ان کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ چار لوگوں میں تقسیم ہونے والی دولت وجائیداد اب تین لوگوں میں بڑی خوش اسلوبی سے بٹ گئی۔ سب کا خیال تھا کہ اتنی عظیم قربانی دے کر زہرہ خاتون نے سب کو بے دام خرید لیا تھا۔

❀......❀......❀

پنجاب یونیورسٹی کے انگلش لٹریچر ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن کے وقت وہ زندگی میں پہلی مرتبہ بہت سے خدشات کا شکار ہوگئے۔ کالج لائف بہت مختلف تھی۔ اپنے پروفیسرز سے بہت کلوز ہونے کی بنا پر انہوں نے ان سب کے تجزیہ اور اپنے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے انگلش لٹریچر کا انتخاب کیا تھا۔

"سید حیدر نقوی!" بہت سالوں بعد پروفیسرز کو ایک حقیقتاً محنتی اور قابل طالب علم ملا تھا۔ ابتدائی کچھ دنوں میں ہی ان کی کلاس میں ایک مکمل الگ پہچان بن گئی۔ سرسٹھ اسٹوڈنٹس کی کلاس میں سید حیدر نقوی کی ایک واحد شخصیت ایسی تھی جس پر ساری کلاس سمیت پروفیسرز کا فوکس ہوتا تھا۔

سفید شلوار قمیص میں سیاہ کھڑی پہنے' کلائی میں سلور ریسٹ واچ' ہاتھوں میں بکس اور نوٹس بیگ..... جب وہ

اپنی متاثر کن شخصیت کے ساتھ کلاس میں آتے تو لڑکیاں دل تھام کر رہ جاتیں۔ بندہ قابل ہو اور مغرور بھی تو قیامت ڈھاتا ہے۔ بالائے ستم کہ لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ اپنے سبجیکٹ پر ان کی محنت نظر آتی تھی۔ جب کلاس میں ڈسکشن ہوتی تو یہ صرف دو لوگ کی گفتگو رہ جاتی' ان کے پروفیسرز اور وہ...... باقی ساری کلاس خاموشی سے ایک بہترین سامع کا رول پلے کرتی۔

آہستہ آہستہ ان کی مقبولیت کا حلقہ وسیع تر ہونے لگا۔ ان کے مقابل کلاس میں بس ایک ہی لڑکی تھی ''صبیحہ فرمان'' سی آر کے لیے ان کے انتخاب پر پہلی مرتبہ اس نے حریف ہونے کا ثبوت دیا۔ سی آر کے لیے ووٹنگ ہوئی تو حیدر حسب توقع جیت گئے۔ اس میں ان کی شخصیت کا بے حد عمل دخل تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک نرم مزاج' نرم گفتار اور عاجزی رکھنے والے انسان تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مغرور تھے مگر بس جنس مخالف کو ایک حد میں رکھنا پسند کرتے تھے۔

ان کے انداز میں ایک ایسی قائل کرنے والی بات ہوتی تھی کہ مقابل نہ چاہتے ہوئے بھی اتفاق کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ کمبائن اسٹڈی کے دوران کلاس فیلوز بڑی بے تکلفی سے ان سے مخاطب ہوتیں مگر وہ صرف اسٹڈی پر فوکس کرتے اور دل میں سوچتے۔

''بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ زہرہ بتول کی تربیت ہو اور ان دنیاوی فضولیات میں ضائع کردی جائے' یہ لوگ کبھی نہیں جان پائیں گے کہ مجھے ان سب لغویات سے کوئی غرض نہیں۔ میری منزل تو کہیں اور ہے میرا راستہ بہت طویل ہے مجھے ایک روشن ستارہ بننا ہے۔''

اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر انہیں سی آر منتخب کیا گیا۔ صبیحہ فرمان کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ پہلے ہی تمام پروفیسرز کی نظروں میں سید حیدر نقوی پہلے نمبر پر تھے اور اپنی جان توڑ کوششوں کے باوجود بھی وہ اس کی پوزیشن کو ڈاؤن نہیں کر پائی تھی۔ دوسرے دن بدن حیدر کی پوزیشن مزید مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ وہ اپنے سارے ٹیچرز کا چہیتا

جواہرات سے قیمتی

❖ جو زبان کو قابو میں نہیں رکھتا' شرمندہ ہوتا ہے۔

❖ اپنی زندگی میں ہر کسی کو اہمیت دو' جو اچھا ہوگا وہ خوشی دے گا جو برا ہوگا وہ سبق دے گا۔

❖ آزادی اس کا نام نہیں کہ اخلاق یا مذہب کی پابندی نہ کی جائے۔

❖ اگر تم ایسی باتیں سنو جو تمہیں ناگوار محسوس ہوں تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ وہ سچی تو نہیں۔

❖ راز کو پوشیدہ رکھنا اپنی عزت بچانا ہے۔

❖ اپنا مزاج درو شانہ رکھو چاہے تمہارا لباس شاہانہ ہو۔

❖ محبت اور خلوص فاصلوں کو مختصر کر دیتے ہیں۔

سدرہ کشف...... خیر پور ٹامیوالی

تھا۔ اسٹوڈنٹس کو باقاعدہ ٹیچرز سے ریکویسٹ کرنا پڑتی تھی کہ وہ حیدر سے ٹائم لے دیں۔ کچھ ڈسکشنز کرنا ہیں' لڑکیوں کے نزدیک وہ اسٹون مین تھا جس کے اندر دل کی جگہ آئس برگ تھا۔ جس دن وہ سی آر بنے' صبیحہ کی ایک چیلی نے بورڈ پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا۔

''سرد ایسا کہ پگھلتا ہی نہ تھا لفظوں سے
آدمی تھا کہ تراشا ہوا پتھر دیکھا!!''

for the most popular C.R of the Class

سب کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

❀......❀......❀

کلاسیکل پوئٹری کی کلاس شروع ہو چکی تھی۔ پروفیسر ذکی الرحمٰن کی کلاس تھی۔ کلاس میں پن ڈراپ سائلنس تھا۔ اس سے پہلے کہ سر اپنا لیکچر شروع کرتے ایک دم صبیحہ فرمان کھڑی ہوگئی۔

''سر! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' اس کے کہنے نے سب کو چونکا دیا۔

''جی کریں۔'' سر نے اپنا کام موقوف کرکے اسے دیکھا۔

"سر! مجھے آپ سے اس کلاس کے سی آر کی شکایت کرنی ہے۔" اس کی بات پر ساری کلاس کے سر حیدر کی طرف گھوم گئے۔

"کیسی شکایت؟" سر کے ماتھے پر شکن آ گئی۔

"سر مجھے بہت مجبور ہو کر آپ کو بتانا پڑ رہا ہے کہ حیدر نقوی مجھے تنگ کرتا ہے۔ میں نے اسے روکنے کی' سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر میں ناکام ہو گئی ہوں۔ اس لیے مجھے یہ معاملہ آپ کے نوٹس میں لانا پڑا ہے۔ سر! یہ دن رات مجھے ٹیکسٹ اور کالز کر کر کے تنگ کرتا ہے۔ سر پلیز اسے سمجھائیں۔ سر پلیز! کچھ کریں۔" اس کے چہرے سے لاچاری اور بے چارگی ٹپک رہی تھی۔

سر ذکی الرحمن کے چہرے پر حیرت کی ایک لہر آئی' انہوں نے حیدر کی طرف دیکھا جوان کے دیکھنے کے انداز پر فوراً کھڑے ہو گئے۔

"حیدر! کیا یہ سچ بول رہی ہے؟" انہوں نے بے یقینی سے حیدر کا چہرہ دیکھا جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا مگر وہ خود پر ضبط کر کے کھڑے رہے۔ ساری کلاس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ بھلا حیدر نقوی یہ سب کر سکتے تھے؟ کوئی یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ دبی دبی سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"سر! اس بات کو سچ جھوٹ کے ترازو پر بعد میں پرکھا جائے پہلے ان سے کہیں کہ کیا کلاس کی باقی لڑکیاں مر گئی ہیں جو میں انہیں ٹیکسٹ یا کالز کروں گا؟ ان میں ایسا کیا ہے جو ایسی گری ہوئی حرکت کی جائے؟" انہوں نے ہاتھ اٹھائے بغیر ایسی مار ماری کہ صبیحہ فرمان کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس کا پروگرام شاید اس پلان کو مزید لمبا کھینچنے کا تھا مگر ایسی بے عزتی کے بعد اس نے فوراً سے ہتھیار پھینک دیے۔

"سوری سر! آج فرسٹ اپریل ہے تو......" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"اپریل فول تو آج آپ بن گئیں صبیحہ بی بی۔" پروفیسر ذکی الرحمن کے چہرے پر ایک محظوظ کن مسکراہٹ تھی۔

اب کی بار ساری کلاس نے قہقہہ لگایا تھا۔

❀......❀......❀

خدا کے فیصلے بڑے مکمل ہوتے ہیں' کوئی اعتراض نہیں کرتا' نہ کر سکتا ہے' دولت سے مالا مال ہونے کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ اس کے پاس باقی صلاحیتیں بھی ہوں۔ فریال خان ایک ایلیٹ کلاس کی امیر زادی...... پچھلے دو گھنٹوں سے ان کے انتظار میں تھی۔ کتنی منتیں کر کے اس نے ان سے تھوڑا وقت مانگا تھا۔ انگلش لٹریچر کے حوالے سے کچھ کونسپٹ کلیئر کرنے کے لیے۔ اور جب وہ یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر آئے تو وہ اپنی نیو ماڈل کی گاڑی کے بونٹ پر ٹیک لگائے کانوں میں ہینڈ فری لگائے ٹائم پاس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

انہیں دیکھ کر چند لمحے سحر زدہ سی رہی' خدا معلوم ایسی کیا بات تھی اس شخص میں جو اتنی شدت سے اپنی طرف کھینچتی تھی مگر وہ ایسا پتھر مجال ہے جو ذرہ بھر بھی اثر ہوتا ہو۔ اتنی خوب صورتی سے لڑکیوں کو ان کی حد میں رکھتے کہ محسوس بھی نہ ہوتا۔ ان کی کامیابیوں کا سفر جاری تھا مگر ذرا سی بھی چھٹی ملنے پر وہ ماما کے پاس بھاگنے کی کرتے۔ زندگی میں ایک عزم ایک ولولہ تھا۔ اس لیے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ وہ بہت مصروف رہتے تھے۔ ماما نے یہ چیز ان کی تربیت میں داخل کر دی تھی۔

❀......❀......❀

اس پرسکون ندی کی مانند بہتی ہوئی زندگی کو پہلا جھٹکا تب لگا جب ظہور ماموں کے بیٹے فیاض نے گھریلو جھگڑوں اور آئے دن باپ کی لعنت وملامت کی وجہ سے خودکشی کر لی۔ معاملہ نازک اس وقت ہوا جب فرقان کی اس کے ساتھ موجودگی پتہ چلی اور اس سے بھی خوف ناک یہ ہوا کہ ظہور ماموں نے فیاض کے قتل کا الزام فرقان نقوی پر لگا دیا۔

"نقوی ولا" میں جیسے ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

ظہور ماموں کا موقف یہ تھا کہ فرقان اور فیاض میں دو دن پہلے جھگڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے فرقان نے انتقام

میں آ کر اسے زہر کھلا دیا تھا۔ سارا خاندان اس بات سے متفق تھا کہ یہ سراسر الزام تھا۔ سب نے نقوی ولا کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔

ظہور ماموں اس طرف داری پر زخمی ناگ کی صورت اختیار کر گئے۔ زینت خالہ اور امینہ خالہ نے جھٹ سوچا' کتنا اچھا ہوا جو انہوں نے ابا کی جائیداد میں سے اپنا حصہ نکلوالیا تھا ورنہ خدا جانے وہ ان دونوں کے ساتھ کیا کرتے اور جانے ان دونوں پر کیا کیا الزام لگاتے۔

ابھی تو زہرہ خاتون نے ان کے لیے اتنی عظیم قربانی دی تھی کہ ان کے لیے اپنا جائز حصہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود ظہور نقوی نے ان کی عزت کا پاس نہ رکھا تھا' اور یوں بلا دریغ بے خوف خطر ان کے بیٹے کو قاتل قرار دے دیا تھا۔

❀......❀......❀

ساری پنچائیت موجود تھی۔ ظہور ماموں نے واضح طور پر فرد جرم فرقان پر عائد کر دی تھی۔

''نقوی ولا'' جیسا وضع دار اور سادہ گھرانہ اس افتاد پر ابھی تک حیران و پریشان تھا۔ ان کے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہ تھا' مگر اللہ کی ذات نے اس مقام پر انہیں تنہا نہ چھوڑا تھا۔ سارا خاندان ساری برادری ان کے ساتھ تھی اور اعلانیہ طور پر ان کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

جب ساری برادری کا دباؤ پڑا تو ظہور ماموں اپنا بیان واپس لینے پر مجبور ہو گئے مگر اپنی بے وقوفی میں کیے گئے اس احمقانہ فیصلے کا نتیجہ بہت بھیانک بھگتنا پڑا تھا۔ زہرہ خاتون نے ان سے قطع تعلقی اختیار کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ جس پر سارا خاندان ان کا ہم نوا تھا۔ رشتے بنانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا رشتوں کو نبھانا مشکل ہوتا ہے۔ وقتی طور پر اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے اور اس شرمندگی و خفت کو مٹانے کے لیے ظہور ماموں نے بھی بڑے تنتنے کے ساتھ رشتوں کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا مگر کہیں اندر سے انہیں بھی پتہ تھا کہ ان کے دل میں چور تھا۔ انہوں نے غلط کیا تھا مگر

جینے کا اصول

زندگی کی شاہراہ پر
چلتے چلتے بے دم ہو کر
ٹھہر جانا' سانس لینا
پھر چل پڑنا
سنو......!
یہ جینے کا اصول نہیں
چلتے رہو چلتے رہو
منزل مقصود پر پہنچنے تک
گر ٹھہر گئے تو مر گئے
چلتے رہے تو جیت گئے

انیلہ سخاوت...... میانوالی

سب کے سامنے یہ غلطی تسلیم کون کرتا؟ اگر انسان آسانی سے اپنی غلطیاں تسلیم کرنے لگ جائے تو دنیا کے آدھے مسائل حل ہو جائیں۔

❀......❀......❀

ناشتے کی میز پر وہ سب لوگ موجود تھے اور موضوع گفتگو حیدر ہی تھے۔ ماما کا کہنا یہ تھا کہ اب جبکہ ان کا ماسٹرز مکمل ہو چکا تھا تو انہیں واپس آ جانا چاہیے۔ بابا کا کہنا تھا کہ انہیں ایم فل میں ایڈمیشن لینا چاہیے اور وہ دونوں اپنی بحث میں الجھے یہ فراموش کر بیٹھے تھے کہ حیدر کا کیا کہنا تھا ناشتے میں دو سلائس اور ایک کپ چائے لینے کے بعد وہ اٹھ کر چلے گئے اور اسی شام جب ماما ان کے لیے شام کی چائے لے کر آئیں تو انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں پاس بٹھا لیا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے ماما۔'' ان کے لہجے میں ہلکا سا اضطراب تھا۔ انہوں نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا پھر پیار سے اس کے بال سنوارے۔

''بھلا ایسی کون سی بات ہے جس نے میرے چاند کو اتنا بے چین کر دیا ہے؟'' وہ محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

حیدر کے چہرے پر روشن مسکراہٹ آ گئی۔ ماما سے بڑھ کر انہیں کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

"آج آپ اور بابا مجھ سے میرے کیریئر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کررہے تھے مگر میری اپنی بھی ایک خواہش ہے اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے مجھے بہرصورت آپ کا ساتھ چاہیے اگر آپ اجازت دیں گی تو میرے راستے روشن ہوں گے میری محنت میں برکت ہوگی اور اگر آپ انکار کردیں گی تو میں سب سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔" ان کے لہجے میں آس امید یقین تھا اور آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بڑا الوہی سا احترام تھا۔ ان کے چہرے پر روشنی پھیلتی گئی۔

"حیدر! میرا بچہ۔" انہوں نے کہتے ہوئے حیدر کا ماتھا چوما۔ "مجھے بتاؤ ایسا کون سا مسئلہ ہے جس نے میرے بیٹے کو اتنا بے چین کردیا ہے؟ ایسا کیا ہے جس کے لیے تمہیں یوں اجازت لینے کی ضرورت پیش آئی؟"

"ماما مجھے سی ایس پی بننا ہے۔" انہوں نے مدھم لہجے میں کہا اور اب وہ انہیں بتا رہے تھے کہ وہ ہمیشہ سے سول سپریئر سروسز میں انٹرسٹ رکھتے تھے اور اب جبکہ ان کی ڈگری مکمل ہوچکی تھی تو اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہوجائیں۔

ماما ان سے تفصیل پوچھ رہی تھیں کہ وہ کس طرح سے تیاری کا آغاز کریں گے اور کیا اس کے لیے وہ لاہور چھوڑ کر یہاں نہیں آسکتے؟ مگر حیدر کا کہنا تھا کہ سی ایس ایس کی تیاری کے لیے لاہور سے بہتر جگہ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ وہاں پر بہترین استاد موجود تھے اور ان کے مضامین کے حوالے سے ہر طرح کا مواد کتابی شکل یا دیگر اشکال جیسے نوٹس ہارڈ یا سوفٹ کاپی میں موجود تھا۔ ماما سمجھنے والے انداز میں ان کی بات سنتی رہیں۔ بیٹے کی اتنی بڑی خواہش اور عزم سے انکار تو کسی صورت ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اس کو ڈھیروں دعاؤں کے جلو میں اجازت دے دی تھی۔ وہ روایتی ماؤں کی طرح نہیں تھیں کہ بیٹے پر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق کوئی زبردستی کا فیصلہ صادر کرتیں بلکہ وہ اس بات پر خوش تھیں کہ حیدر نے اپنی مرضی سے اپنی منزل اور کیریئر کا چناؤ کیا تھا۔

❀......❀......❀

جنون عشق کو شاید......
بدلنا بھی نہیں ممکن!
جو دھن ہو کر گزرنے کی!
تو پلک جھپکائی جائے کیوں؟

اور یہ بات ان سے ملنے والا ان کو جاننے والا ہر شخص کہتا کہ "جب حیدر نقوی کچھ کر گزرنے پر اتر آئے تو اس کو کون روک سکتا ہے؟"

ان کے پروفیسرز اسے سولہ سے اٹھارہ گھنٹے پڑھتے دیکھتے تھے وہ سب اپنے اپنے شعبے کے ماہر تھے جانتے تھے کہ جس راستے کا انتخاب وہ کرچکا تھا وہ راستہ کوئی پھولوں کی سیج نہ تھا بلکہ وہ کانٹوں، مسئلوں اور کٹھنائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس راستے کو عبور کرنے کے لیے کئی آگ وخون کے دریا پار کرنے پڑتے تھے۔ کئی کڑی منزلوں کو پاٹنا پڑتا تھا۔

وہ سب جانتے تھے کہ اس راہ میں کہاں روا چٹان میں بدلتا تھا اور ایک گھڑا کھائی کی صورت اختیار کرسکتا تھا۔ اس لیے وہ اس کا ہاتھ رہنمائی کی روشن چھڑی میں تھامے اس کے لیے ہر طرح سے رہبری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اپنے انتہائی قیمتی وقت سے وقت نکالنا بڑا مضمحل تھا مگر اس کے لیے یہ کیا گیا۔ وہ لگن اور شوق جوان میں تھا وہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے اور اسی چیز کی وجہ سے سب کی بے پناہ امیدیں تھیں کہ وہ پہلی کوشش میں ہی مقابلے کا امتحان پاس کرجائیں گے۔

ماما تو ہر قدم پر ان کے ساتھ تھیں۔ ویک اینڈز پر وہ گھر آتے تو جیسے ہر چیز میں جان سی پڑ جاتی۔ وہ صرف ان کا بیٹا ہی نہیں بلکہ وہ ان کا دوست بھی تھا جس سے وہ ہر بات شیئر کرتی تھیں اور سب سے بڑھ کر ان کا با اعتماد مشیر تھا جس سے وہ ہر طرح کے معاملات پر مشاورت کرلیا کرتی تھیں۔

ان کے سی ایس ایس کے پیپرز فروری میں تھے اور دسمبر کی چھٹیوں میں وہ گھر آئے ہوئے تھے جب وہ واقعہ

پیش آیا جس نے آنے والے وقت میں ان کے گھر کئی مزید فسادات اور جھگڑوں کی بنیاد رکھی اور ان کی زندگیوں میں وہ طوفان لے کر آیا جس سے ان کا آشیانہ بکھر گیا۔

وہ اکیس دسمبر کی ایک سرد اور ٹھٹھرتی شام تھی جب زینت خالہ اور خالوان کے گھر حیدر کے لیے اپنی بیٹی ثانیہ کا رشتہ لے کر آئے۔

''نقوی ولا'' میں جیسے ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔

زینت خالہ انتہا درجے کی خودغرض' مکار اور سازشی ذہنیت رکھنے والی عورت تھیں۔ حیدر پر تو ان کی نظر بڑی دیر سے تھی اور ثانیہ کے لیے ہمیشہ انہوں نے حیدر کو ہی سوچا تھا۔ بھلا اپنی انٹر فیل بیٹی کے لیے (جسے نہ بولنے کی تمیز تھی نہ بیٹھنے اٹھنے کی) حیدر سے بہتر لڑکا انہیں کہاں سے ملتا؟ اتنا خوب صورت' پڑھا لکھا لڑکا جس کا مستقبل اس کے کردار کی طرح روشن تھا اور اس جیسا فرماں بردار' نرم گو اور زہرہ خاتون کی بہترین تربیت کا مظہر...... وہ چاہتی بھی تو ایسا گوہر نایاب اپنے کھوٹے سکے کے لیے نہ ڈھونڈ سکتی تھیں۔

ان کی نظریں تو بڑی دیر سے تاڑ چکی تھیں کہ شکار کیسے پھانسا ہے بلکہ انہیں یقین تھا کہ انہیں کوئی مسئلہ نہ ہوگا' زہرہ خاتون کو ان کی سادگی اور بھولپن کی وجہ سے وہ بڑی آسانی سے اپنی راہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کر سکتی تھیں۔ اسی لیے جب انہوں نے حیدر کے لئے ثانیہ کا رشتہ ڈالا تو انہیں یقین تھا کہ یہ معاملہ تو اسی دن حل ہو جائے گا' انکار کی نہ تو کوئی وجہ تھی نہ ہی کوئی ایسا درمیان میں تھا جو کسی طرح بھی معاملے کو خراب کرنے کی کوشش کرتا۔ دوسری طرف زہرہ خاتون کو جب آنے کا مقصد پتا چلا تو وہ بھی کسی حد تک مخمصے کا شکار ہو گئیں۔

انہوں نے زینت خاتون کو حیدر کے ماتھے کے چٹا چٹ بوسے لیتے دیکھ کر سوچا بھلا حیدر کا کیا ری ایکشن ہوگا؟ اور جیسے ہی زینت خالہ واپسی کے لیے نکلیں' اس کا ری ایکشن سامنے آ گیا۔ وہ اس قدر مشتعل تھا کہ ماما کو اسے سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔ اسے جیسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ماما نے اتنا کولڈری ایکشن دیا تھا۔

''ماما! آپ اگر ایسا سوچ رہی ہیں کہ جو خالہ کا خیال ہے میں وہ پورا کروں تو یہ ناممکن ہے۔ آپ بھول جائیں ایسا کچھ بھی ممکن ہو سکے گا۔'' اس کا اتنا بگڑا ہوا انداز وہ پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔ اسے مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش ناکام جاتی دیکھ کر وہ اس سے ناراض ہو گئیں۔

اگلی صبح وہ ان کے کمرے میں گئے تھے اور بڑے تھکے انداز اور افسردہ دل کے ساتھ ان سے اپنے دل کی حالت شیئر کر کے اسی طرح واپس چلے گئے۔

❀......❀......❀

اور وہ تو چلا گیا مگر زہرہ خاتون کو سوچوں کے عمیق سمندر میں ڈوبا چھوڑ گیا۔ وہ بیٹا تھا اور بیٹا بھی ایسا فرماں بردار جس پر وہ فخر کرتی تھیں مگر اب کی بار وہ کیسے دوراہے پر لے آیا تھا انہیں؟ انہوں نے خود کو ہمیشہ اپنی اولاد کے سامنے آئیڈیل بنا کر پیش کیا تھا مگر انہیں اس چیز کا اندازہ نہیں تھا کہ حیدر یہ آئیڈیلزم اپنی زندگی کے ساتھی میں بھی ڈھونڈے گا۔ اندر سے وہ خوش بھی تھیں اور دکھی بھی۔ کچھ ایسے ہی ملے جلے تاثرات تھے ان کے اور اگلی صبح بابا علی رضا ان کے پاس بیٹھے انہیں سمجھا رہے تھے۔

''زہرہ! وہ آج کے دور کا لڑکا ہے اگر وہ راضی نہیں ہے تو ہمیں زبردستی نہیں کرنا چاہیے۔ ہم نے زندگی کے ہر مرحلے پر اسے آزادی دی ہے ہمیں اب اسے یوں مجبور نہیں کرنا چاہیے۔'' ان کا لہجہ مدھم اور مضبوط تھا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ وہ خوش نہیں ہے مگر آپ خود سوچیں میں زینت کو کس طرح انکار کروں؟ بیٹی کا معاملہ ہے' اور بیٹیوں کے معاملے بڑے نازک ہوتے ہیں۔'' وہ سخت الجھن میں تھیں۔

''تم زیادہ دل پر لے رہی ہو۔ میں مانتا ہوں کہ یہ بیٹی کا معاملہ ہے' مگر ابھی یہ صرف ایک بات ہے کچھ بھی فائنل نہیں ہوا۔'' ان کا انداز دوٹوک تھا۔

''مگر اب تک یہ معاملہ سب کے علم میں آ چکا ہے۔ ہم پیچھے ہٹیں گے تو لوگ باتیں بنائیں گے۔'' وہ

مضطرب ہوئیں۔

''تمہیں لوگوں کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ لوگ تو ہر حال میں باتیں بناتے ہیں۔ لوگ تو تب بھی باتیں بناتے تھے جب وہ لاہور پڑھ رہا تھا۔ لوگوں نے تو تب بھی باتیں بنائی تھیں جب اس نے لٹریچر کا انتخاب کیا تھا' جب تم نے تب ان چیزوں کی پروا نہیں کی تو تمہیں اب بھی نہیں ہونی چاہیے۔'' بابا نے کہا۔ ماما خاموشی سے چند لمحے انہیں دیکھتی رہیں۔

''مجھے لگتا ہے مجھے ایک دفعہ پھر حیدر سے بات کرنی چاہیے۔ مجھے لگتا ہے میں اسے منالوں گی۔'' ان کے انداز میں امید تھی۔

''ٹھیک کہا' تم اسے منالو گی مگر اس کے دل کو نہیں' پھر بھی بات کر کے دیکھ لو۔ ویسے بھی رات اس کا جوری ایکشن تھا مجھے نہیں لگتا کہ اب وہ اس موضوع پر بات بھی سنے گا۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھے اور وہاں سے نکل گئے۔ اور دہری کشمکش میں مبتلا زہرہ خاتون وہیں بیٹھی رہ گئیں۔

❀......❀......❀

ان کی ڈھیروں دلیلوں اور فوائد بتانے کے بعد کہ خاندان میں شادی کتنی سود مند ہے اپنے' اپنے ہی ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور انہوں نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا تھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ماما' آپ اسے بہو بنا کر لے آئیں مگر میں اسے بیوی نہیں بناؤں گا۔'' ان کے لہجے میں ایسی سرد مہری تھی کہ چند لمحے ماما گنگ سی رہ گئیں۔

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' ان کے انداز میں حیرت نمادکھ تھا۔

''میں ایسا گستاخ اور بے ادب نہیں ہوں۔ میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں۔'' ان کا لہجہ دھیما ہی تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تنے ہوئے چہرے کے ساتھ وہاں سے نکل گئیں۔ ماہا خاموشی سے یہ سب ہوتا دیکھ رہی تھی۔ بھائی اور ماما کے درمیان کوئی تنازعہ پہلی دفعہ پیدا ہوا تھا اور وہ بھی اتنا طول پکڑ گیا تھا۔ ان کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ واپس لاہور چلے گئے۔

ایک بار پھر ان کی اپنی دنیا تھی' جو آباد ہو گئی تھی' اور سارے مسائل وہ کہیں پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔

❀......❀......❀
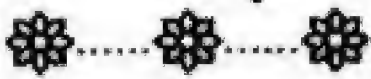
زینت خالہ کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا وہ ہر صورت کوئی مثبت جواب سننا چاہتی تھیں جبکہ زہرہ انہیں ٹال ٹال کر تھک چکی تھیں۔ اب مزید اس معاملے کو لٹکانا فضول تھا۔ مگر وہ اسے یوں فون پر ختم کر سکتی تھیں نہ حل' اس کے لیے انہیں ہر حال میں زینت خاتون کے پاس جانا تھا اور ان سے یہ معاملہ تفصیلاً ڈسکس کرنا تھا اور انہیں ٹھنڈے دل سے سمجھانا تھا کہ جب ان کا اپنا بیٹا ہی نہیں مان رہا تو وہ کس برتے پر ہاں کریں۔

اور جب یہی بات انہوں نے علی رضا کو بتائی تو انہوں نے بھی اتفاق کیا تھا کہ فون پر انکار کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ خود مل کر اس مسئلے کا حل نکالیں۔

جنوری کے آخری دن تھے۔ حیدر اس ماہ کے ویک اینڈ پر گھر نہیں آسکے تھے۔ اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں ان کے ایگزامز اسٹارٹ ہو رہے تھے اس لیے انہوں نے معذرت کر لی تھی۔ البتہ جب انہیں پتا چلا تھا کہ ماما اور چھوٹی بہن ماہا خالہ کی طرف جانے کی تیاریوں میں تھیں تو انہوں نے جواباً خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مثبت یا منفی کسی بھی قسم کے تاثرات کا اظہار نہ کیا تھا۔

ان کے پیپرز میں دو دن رہتے تھے جب ماہا کا فون آیا تھا کہ اگلی شام وہ لوگ آبائی گاؤں روانہ ہو رہے تھے۔ حیدر نے سرسری طور پر سنا تھا' اس بات کو' ان کے ہاتھ میں نوٹس تھے اور ان کا سارا دھیان ان کی طرف لگا ہوا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ زندگی آئندہ ان کے ساتھ کیا کرنے والی تھی۔

ان کے ابتدائی دو پیپرز انتہائی شاندار ہوئے تھے اور اگلے دن جبکہ ان کے مزید دو پیپرز تھے اور وہ چائے پیتے ہوئے ماما سے بات کر رہے تھے جو کہ زینت خالہ کے گھر

پہنچ چکی تھیں۔ پندرہ منٹ تک وہ ان سے تفصیلاً بات کرتے رہے۔ سفر کا احوال، ان کا حال چال اور دیگر معاملات پر، پھر انہوں نے فون بند کردیا۔

❀......❀......❀

زینت خالہ ان کے ساتھ بیٹھی تھیں اور ان کے اردگرد امینہ خالہ اور ثانیہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ زہرہ خاتون نے تھوک نگل کر زینت خالہ کو دیکھا جو اس آس پر ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھیں کہ شاید وہ رشتہ پکا کرنے آئی تھیں مگر ساتھ شگن کا سامان اور مٹھائی کیوں نہیں تھی؟ ان کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

انہوں نے تو ثانیہ کو بھی دلہن کی طرح تیار کروایا تھا جو کہ تیز اورنج اور پیرٹ کنٹراسٹ میں انتہائی اناڑی پن سے کیے گئے میک اپ میں بے حد بھونڈی لگ رہی تھی۔

مگر زہرہ کے تاثرات نے انہیں ٹھٹکا دیا تھا۔ مستزاد وہ ماہا کے ساتھ آئی تھیں، ان کے ساتھ فوقی یا علی رضا کیوں نہیں آئے تھے؟ ان کے اندر خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ضرور تھا۔ ان کی سوالیہ نگاہیں زہرہ خاتون کے چہرے پر جم گئیں۔ انہیں جواب اسی چہرے سے چاہیے تھا۔

زہرہ خاتون نے بڑے دھیمے انداز میں بات شروع کی تھی مگر ان ادھوری بات سے ہی زینت خالہ پورا مفہوم پا گئیں اور اس کے ساتھ ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے ان کا رنگ سرخ پڑ گیا اور آنکھیں خوف ناک حد تک باہر کو ابل آئیں اور وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت لگا کر چیخ اٹھیں۔

''بس زہرہ! آگے ایک لفظ مت بولنا۔''

''میری بات تو سنو زینت۔'' انہوں نے گڑبڑا کر کچھ کہنا چاہا مگر ان کی مدھم آواز کہیں اندر ہی دب گئی اور زینت پورے زور سے چلانے لگ گئیں۔

''تم مجھے یہاں یہ بتانے آئی ہو کہ تمہارا بیٹا نہیں مانتا اس رشتے کے لیے...... ارے یہ خنجر وہاں بیٹھی گھونپ دیتیں۔ یہاں مجھ بوڑھی کا اور میری معصوم بیٹی کا تماشا دیکھنے

کیوں چلی آئیں؟'' ان کے انداز میں اتنا واویلا تھا کہ زہرہ گھبرا کر اٹھ گئیں۔

''تم بالکل غلط سمجھ رہی ہو میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا زینت! میں نے تو سوچا تھا کہ گھر کی بات ہے مل بیٹھ کر سلجھا لیں گے۔'' وہ جلدی جلدی وضاحت دے رہی تھیں۔

''گھر کی بات؟ کون سی گھر کی بات؟ تم تو مجھے ذلیل کرنے آئی ہو یہاں! ہونہہ بیٹا نہیں مانتا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ اسے وہاں عیاشیوں کے لیے بھیجا ہوا ہے باہر منہ مارنے کی عادت پڑ گئی ہے اسے گھر کا کھانا اسے پسند نہیں رہا۔ وہ کیوں پسند کرے گا میری معصوم نیک اور صوم وصلوٰۃ کی پابند بیٹی کو۔ اسے باہر کا نشہ لگ گیا ہے۔ خاندان کے سامنے ڈھونگ کیوں رچاتا ہے فرماں برداری کا؟ شکل دیکھو اور کرتوت دیکھو...... ارے رامینہ! دیکھو اس نے بہن ہو کر میرا کلیجہ چاک کردیا۔ زہرہ جا...... میری بددعا ہے تجھے کبھی سکھ نہ ملے...... تیرا بیٹا دنیا میں ذلیل ہو، کیڑے پڑیں اس میں۔'' وہ نفرت سے بین کرتی بددعائیں دے رہی تھیں۔ اور زہرہ خاتون کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔

''میرے بیٹے کو بددعا مت دو زینت...... اسے کچھ مت کہو۔'' انہوں نے گھٹی گھٹی سانس کے ساتھ کہا ان کا دل بے حد ڈوب رہا تھا اور بائیں بازو میں درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

''کیوں نہ کہوں...... دس بار کہوں گی۔ تمہیں کوئی خوشی نصیب نہ ہو اولاد کی جیسے تم نے میری بیٹی کو ذلیل و رسوا کیا ہے اسی طرح تیری ماہا ذلیل ہو۔'' وہ برابر بددعائیں دے رہی تھیں۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کر یکلخت زہرہ کو دھکے دینے شروع کردیے۔

''نکلو میرے گھر سے میں تم دونوں کو ایک منٹ یہاں برداشت نہیں کروں گی، تم جیسی سازشی اور مکار عورت کو اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ انہیں باہر کی طرف دھکیل رہی تھیں۔

ماہا بلند آواز میں رو رہی تھی۔ مگر وہاں اس کی پکار سننے والا کون تھا۔ زہرہ ان کی منت کر رہی تھیں کہ ان کی بات سن لیں مگر زینت خالہ میں جانے کون سی چڑیل کی بدروح سمائی ہوئی تھی کہ وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھیں۔ امینہ خالہ شاید ان کو روکنے کی کوشش کرتیں مگر اس سے پہلے ہی زہرہ چکرا کر گریں اور ماہا کی چیخ سارے کمرے میں پھیل گئی۔

❀......❀......❀

انہوں نے فون کی طرف دیکھا جو پھر سے بج رہا تھا۔ انہیں حیرت ہوئی ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی تو ان کی ماما سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے فون اٹھایا اور پھر ساری زندگی وہ یہی سوچتے رہے کہ کاش انہوں نے یہ کال کبھی نہ پک کی ہوتی۔

جو خبر انہیں سنائی گئی تھی وہ اس قدر خوف ناک تھی کہ چند لمحوں تک ان کا سانس، ٹریفک جام کی طرح رک سا گیا۔ ساکت! اور ہر چیز پس منظر میں چلی گئی۔

وہ ہستی، جس میں ان کی جان تھی...... وہ ذات، جس سے انہیں عشق تھا...... وہ پاکیزہ صفت، جس نے درندوں کی اس دنیا میں انہیں انسان بنایا تھا...... ان کی زندگی کا اثاثہ...... ان کا سرمایہ حیات...... ان کی زندگی کی وجہ...... ان کی متاع جاں!

ان کی پیاری ماما انہیں چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی تھیں۔ کیسی ہولناک آتش زدگی ہوئی تھی ان کے وجود میں۔ انہیں لگا اب شاید وہ کبھی سانس نہ لے سکیں گے۔ نہ ہی کبھی اس دنیا کا سامنا کر سکیں گے۔ سب ختم ہو گیا تھا۔

ان کی زندگی کی وجہ...... آگے بڑھنے کی دھن...... کچھ کر کے دکھانے کی چاہ...... اور ایک منزل کی جستجو......!! سب ختم ہو گیا۔

ہر چیز مٹھی میں بند ریت کی مانند پھسلتی گئی...... مر جانا! چلے جانا نہیں ہوتا...... چلے جانے والے کبھی نہ کبھی ضرور لوٹ آتے ہیں...... نا بھی آئیں، آس پھر بھی رہتی ہے...... مر جانے والے کبھی نہیں لوٹتے......

نا ہی کوئی امید، کوئی آس، کوئی چراغ، کوئی لو باقی رہتی ہے......

بس رات رہ جاتی ہے...... کالی سیاہ رات...... کالی دکھ جیسی دکھوں کے بھی رنگ ہوتے ہیں...... موت کا دکھ کالا ہوتا ہے...... سیاہ اور تاریک...... مر جانے والے کبھی نہیں لوٹتے...... اور پیچھے رہ جانے والوں کو روند جاتے ہیں...... کالے اور سیاہ رنگ والے دکھ کے پتھروں تلے......

آج تین دن گزر چکے تھے اس قیامت کو ان کی ذات پر بیتے...... اور ان تین دنوں میں صرف یہ ہوا تھا کہ وہ خاموشی سے ایک جگہ جامد بیٹھے رہتے اور انہیں خبر بھی نہ ہوتی اور آنسو ان کی آنکھوں سے بہتے جاتے اور پھر ان کا بی پی شوٹ کر جاتا اور وہ اپنے حواس کھو دیتے......!! صدمہ اس قدر جان لیوا تھا کہ ان کا ذہن اسے تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ جیسے جیسے وہ اسے سوچتے...... ان کا دل تڑپتا...... ان کا دماغ احتجاج کرتا...... جسم کا بند بند چیختا اور مجبوراً نروس سسٹم ان کو عارضی بے ہوشی کی طرف دھکیل دیتا۔

اگرچہ ''اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کسی جان پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔'' مگر نجانے کیوں یہ اذیت ان کی رگ رگ کو توڑ رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی اس صدمے کو سہار نہ پا رہے تھے۔ جانکنی کی اس حالت میں بھی انہیں ماما ہی یاد آتیں۔ اپنی الوہی مسکراہٹ اور آفاقی محبت کے ساتھ۔ اور ان کا روم روم چیختا......

''ماما! میری پیاری ماما! واپس آجائیں، بس ایک بار واپس آجائیں، میں آپ کی ہر بات مان لوں گا ایک بار واپس آجائیں۔'' نیند کی ادویات زیر اثر سوتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے اور دل سے خون!!

ڈاکٹرز کہتے تھے ماما کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا مگر وہ جانتے تھے یہ ہارٹ اٹیک کب تھا یہ تو صریحاً قتل تھا۔ جو ایک بہن نے دوسری بہن کا کیا تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی ذاتی رنجش نہ تھی۔ دونوں کو اپنی اپنی اولاد عزیز تھی۔ اور اپنی اپنی عزیز چیز کو بچاتے ہوئے ایک نے جان ہار دی۔

ان کو لگتا ماما تو ایک ہی دفعہ اذیت برداشت کر کے اس دنیا کے دکھوں سے نجات پا گئی تھیں ان کا کیا؟ جن کا

دل ہر لحظہ ڈوبتا تھا۔ وہ جیسے خود پر سے اختیار کھو بیٹھے تھے۔ انہیں تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ سی ایس ایس کے پیپرز دے رہے تھے اور ابھی تو صرف ان کے دو پیپرز ہوئے تھے۔ ان کا فون بجتا رہتا...... پروفیسرز کے فون' کلاس فیلوز کے فون' بیچ میٹس کے فون' تعزیتی فون۔ مگر وہ کسی سے بات ہی نہ کرتے' دنیا میں' دنیا کے معاملات میں ان کی دلچسپی یکسر ختم ہوگئی تھی۔

مگر دنیا انہیں واپس بلاتی تھی...... اور وہ واپس جانے پر آمادہ نہ تھے۔

بابا' ماہا اور فوقی...... سب اس کو سمجھانے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہتے مگر ناکام رہتے۔ قصور ان کا بھی نہیں تھا۔ وہ کوشش کرتے تھے مگر کوشش ناکام ہوجاتی۔

ماما کی جدائی ان کے دل میں کسی گرم سلاخ کی مانند گڑی تھی۔ جو دن رات سلگتی رہتی تھی اور درد تازہ رہتا تھا کم ہی نہ ہوتا تھا۔ گھٹتا ہی نہ تھا' بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ درد کا اثر پھیلتا ہی چلا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک شام جبکہ دھند ہر سو چھائی ہوئی تھی اور ماحول میں ایک دکھ بھری اداسی تھی۔ ماہا شام کی چائے لے کر آئی تو وہ بیڈ پر نیم دراز تھے اور آنکھیں جانے کہاں مرکوز تھیں۔

ماہا کے آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔ وہ سسکیاں دباتی باہر نکل گئی۔ حیدر بے خبر تھے اور اسی طرح ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

❁......❁......❁

وہ ہمیشہ کی طرح ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ اور ماما بڑے پیار سے ان کے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھیں۔

''حیدر! میری آنکھوں کا نور' میری دھڑکن' میری زندگی......'' انہوں نے حیدر کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا تھا اور جواباً ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ماما! میری پیاری ماں' آپ کہاں چلی گئی ہیں؟'' انہوں نے بے تابی سے ان کا ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

''پگلے! میں تو ماں ہوں' میں کہاں جاؤں گی' میں تو ادھر ہی ہوں تمہارے پاس۔ تم نے دیکھا ہی نہیں۔'' وہ اسے یقین دلا رہی تھیں۔

''مگر آپ میرے پاس کیوں نہیں ہیں؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتیں؟'' وہ ضبط کھو بیٹھے تھے ان کی آنکھوں سے کئی بے تاب آنسو نکل کر ماما کے ہاتھ کو گیلا کر گئے۔

''دل کی آنکھ سے دیکھا ہوتا تو نظر آتی۔ تمہیں تو غم منانے سے فرصت نہیں۔ میں کہاں سے آؤں؟ جانتے ہو مجھے کس قدر دکھ دیتے ہیں تمہارے آنسو...... میری روح چھلنی کرتے ہیں تمہارے آنسو! مجھ سے تمہارا دکھ دیکھا نہیں جاتا حیدر! میرا چاند مت رویا کرو' میں نے ایسا کب چاہا تھا' کب یہ تصور کیا تھا کہ تم خود کو یوں برباد کرلو گے؟ مجھے اس سے کیا خوشی ملے گی؟ کبھی سوچا ہے تم نے کہ تمہاری اس بکھری زندگی سے مجھ پر کیا اذیت گزر رہی ہے؟ میں نے تمہیں اس لیے کب پیدا کیا تھا کہ میرا حیدر...... میرا شیر یوں دل ہار کر بیٹھ جائے گا۔ میں تمہیں ایسا دیکھنا چاہتی تھی کہ دنیا تم پر فخر کرے' رشک کرے' ایک مثال بنانا چاہتی تھی میں تمہیں۔ اور تم میرے سارے خوابوں کو چھوڑ کر یوں خود کو کمرہ بند کرکے بیٹھ گئے ہو تو خود ہی بتاؤ اس سے مجھے کیا خوشی ملے گی؟ اٹھو حیدر! تمہیں میرے بکھرے آشیانے کو سنبھالنا ہے۔ دیکھو تمہاری ایک چھوٹی بہن ہے' جو کس قدر تنہا اور دکھی ہے' تمہارا ایک چھوٹا بھائی ہے' جو تمہیں بے خبر اور بے پروا جان کر دوستوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تمہارے بابا...... کس قدر اکیلے ہوگئے ہیں۔ کتنا جھک گئے ہیں ان کے کندھے۔ تم بڑے بیٹے ہو اس گھر کے' تمہیں سنبھالنا ہے انہیں' ان کا بازو بننا ہے۔ اٹھو میرا بچہ! ابھی تو زندگی باقی ہے ابھی تم نے بہت کچھ کرنا ہے' اگر تم ہمت ہارو گے تو ان سب کو کون سنبھالے گا؟'' ان کا لفظ لفظ صداقت بن کر حیدر کے دل میں اتر رہا تھا۔

''وعدہ کرو تم خود کو سنبھالو گے؟'' انہوں نے بڑے پیار سے وعدہ لینا چاہا۔ حیدر نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں ماما! میں آپ کی ہر بات مانوں گا' آپ کی ہر امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔" انہوں نے مضبوطی سے ماما کا ہاتھ تھام کر وعدہ کیا تھا۔ ماما کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ آ گئی تھی۔

❀......❀......❀

ان کی آنکھ کھلی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے تیزی سے اردگرد دیکھا مگر وہاں صرف ایک احساس ایک خوش بو تھی جو انہیں بتا دیتی تھی کہ ماما یہاں تھیں یا پھر ان کا لمس جو انہوں نے اپنے ہاتھ پر محسوس کیا تھا۔

اور اس لمس نے ان کے اندر ایک نئی توانائی اور ایک نئی روح پھونکی تھی۔ جیسا ان کا دوسرا جنم ہوا ہو۔ ایک نئی زندگی کا آغاز......!! ان کی زندگی کے قیمتی ترین چھ ماہ ضائع ہو چکے تھے۔ وہ واپس نہیں آ سکتے تھے مگر باقی زندگی تو بدلی جا سکتی تھی۔ ان کے پیپرز ضائع ہو چکے تھے۔ اور اب وہ اس پر جتنا بھی افسوس کرتے وہ واپس نہ آ سکتے تھے۔

لاہور جب وہ واپس گئے تو ان کے پروفیسرز بھی از حد دکھی تھے مگر یہ بات سب جانتے تھے کہ وہ اپنی والدہ سے کس قدر اٹیچ تھے اور یہ صدمہ ان کے لیے اس قدر جان لیوا تھا کہ اب وہ سنبھل گئے ان کے لیے یہی غنیمت تھا۔

سی ایس ایس کی اگلی اسٹمیٹ میں ابھی چھ ماہ باقی تھے۔ سب کے اصرار اور حوصلہ دینے پر وہ دوبارہ سے ایگزامز کے لیے تیار ہو گئے۔

مگر اب منزل آسان نہ تھی۔ ان کے کلاس فیلوز' دوست اور بیچ میٹس جن سے ان کی بڑی اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی وہ اپنی منزل میں ان سے ایک قدم آگے نکل چکے تھے۔ اس سفر میں اب اس نازک موڑ پر نئے دوست ڈھونڈنا اور ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو پانا بہت مشکل تھا۔ مگر یہاں بھی سب نے ان کا ساتھ دیا تھا۔

دوبارہ سے ساری چیزوں کو مینیج کیا گیا اور ایک بار پھر سے ان کی روٹین اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ اب وہ پہلے سے بڑھ کر محنت کر رہے تھے۔ ہر ویک اینڈ پر وہ گھر آتے تھے ماہا اور فوقی سے چھوٹی چھوٹی ڈھیروں باتیں اور کہیں گھومنا پھرنا...... یہی تو خوشیاں تھیں۔ بابا سے گھریلو مسائل اور خاندان میں ہونے والے نت نئے واقعات پر بات ہوتی۔ آہستہ آہستہ ہی سہی مگر زندگی ان کے گھر بھی نارمل ہونے لگی تھی۔

ایک سال گزر گیا' وقت کتنی جلدی بیت جاتا ہے اور انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کتنی چیزوں اور لوگوں کو فراموش کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اللہ کا کس قدر کرم ہے کہ اس نے مردوں کو دفنانے کا حکم دیا ورنہ شاید کوئی بھی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔

زہرہ خاتون کی پہلی برسی پر جب کہ زینت خالہ اور امینہ خالہ سے ان کا بالکل بائیکاٹ تھا اور ماموں سے سارے تعلقات پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ وہ ماموں جنہوں نے فوقی پر بے بنیاد الزام لگایا تھا اور زہرہ خاتون کی وفات پر کیسے رو رو کر حیدر کو فون کر کے معافی مانگتے رہے تھے اور بس ایک التجا کی تھی کہ خدارا انہیں اپنی بہن کا چہرہ ایک دفعہ دیکھنے دیا جائے۔

اور حیدر نے انہیں اجازت دے دی تھی۔ وہ اتنے ظالم اور سخت دل نہ تھے' مگر جانے یہ ظہور ماموں کی بدقسمتی تھی یا تقدیر کا انتقام کہ چاہنے کے باوجود وہ وقت پر نہ پہنچ سکے اور زہرہ خاتون کو لحد میں اتار دیا گیا۔ ان کی پہلی برسی پر دونوں خالائیں اکٹھی ہو کر آئی تھیں۔

حیدر نے انہیں کسی قسم کی پرانی بات کا حوالہ نہ دیا تھا اور نہ ہی ان پر کوئی قدغن لگانے کی کوشش کی تھی بلکہ انہوں نے بڑی دریا دلی سے انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی ملنے جلنے والا کسی کی تعزیت کرنے جائے' انہوں نے بھی ان دونوں کو ایسا ہی سمجھا تھا اور زیادہ اہمیت دے کر کوئی سین کریٹ نہ کیا تھا۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ دونوں ماہا کو لپٹا لپٹا کر روتی رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ایسے بین ڈالے تھے کہ ہر آنکھ نم ہو گئی۔ اور جب قرآن خوانی کے بعد کھانا کھلایا گیا تو وہ دونوں سب سے الگ ہو کر علی رضا کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔

ماضی کی بے وقوفیوں پر اشک ندامت بہائے گئے اور

معافیاں تلافیاں ہوئی تھیں۔ مگر اب اس سب کا کیا فائدہ تھا کہ جانے والی ہستی چلی گئی‘ ان کی قسمت میں ایسی ہی موت لکھی تھی۔

علی رضا نے بات کو بردباری سے سمیٹ دیا تھا‘ جو ہو چکا تھا اسے بدلنا ممکن نہ تھا‘ پھر کیوں کر ممکن تھا کہ وہ دوبارہ سے اس ٹاپک کو شروع کرتے جس کا کوئی انجام نہ تھا۔ ویسے بھی وہ مزاجاً فراخ دل اور سمجھ دار انسان تھے کہ اب اس موضوع پر مزید بحث سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

مگر بڑی عجیب بات ہوئی۔ زینت خالہ اپنے بڑے بیٹے سید وجاہت کے لیے جو کہ ایک پولیس آفیسر تھے کا رشتہ ماہا کے لیے لے کر آئی تھیں۔ بابا عجیب الجھن کا شکار ہو گئے۔

زینت خالہ کا کہنا تھا کہ حیدر اور ثانیہ کا رشتہ خدا کو منظور نہ تھا مگر وہ ہر صورت ماہا کو اپنی بیٹی بنا کر لے جائیں گی۔ اور ان کی یقین دہانیاں......!!

”رضا بھائی! اس بار مجھے مایوس نہ لوٹایئے گا۔ ماہا کو میرے وجاہت کا نصیب بنادیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں اسے زہرہ سے زیادہ پیار کروں گی‘ اپنی ثانیہ سے زیادہ اہمیت دوں گی۔ اس کی زندگی میں ماں کی کمی نہیں رہنے دوں گی۔ بس آپ پرانی باتوں کو بھلا کر میری جھولی میں یہ ہیرا ڈال دیں۔ رضا بھائی! اس بار میں انکار نہیں سنوں گی۔“ مان‘ دھونس اور رعب سے انہوں نے اپنی بات منوانے کی ٹھانی ہوئی تھی اور موقع بھی ایسا شاندار جس میں ساری برادری موجود تھی۔ ان کی ندامت ان کے آنسو ان کا واویلا اور سب سے بڑھ کر ان کے دعوے ہر چیز بہت متاثر کن تھی۔

اور جیسا کہ وہ ارادہ کر کے آئی تھیں وہ اپنی بات منوا کر گئیں۔ خاندان میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ جسے بھی پتا چلا کہ سید علی رضا نے ماہا کا رشتہ زینت خالہ کو دے دیا ہے اس نے حیرانی سے انگلیاں منہ میں دبالی تھیں۔ یوں ایک بار پھر دو خاندانوں کے درمیان آنے والی خلیج پاٹ لی گئی۔

کچھ دن بعد ایک باقاعدہ رسم میں سیدہ ماہا بتول کو سید وجاہت نقوی کا بنادیا گیا۔

❀......❀......❀

ان کا سی ایس ایس کا رزلٹ آنے والا تھا‘ زینت خالہ نے ماہا اور وجاہت کی شادی کی بات شروع کردی۔ علی رضا ابھی اس حق میں نہ تھے کیونکہ ایک طرف وہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ پڑھ رہی تھی دوسری طرف وہ حیدر کے سیٹل ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ دونوں بہن بھائیوں کی ایک ساتھ شادی کی جاسکے مگر زینت خالہ نے جو جلدی مچائی ہوئی تھی اس کی وجہ سے ایسا ممکن ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

اور ابھی یہ بات ملتوی کی جارہی تھی جب حیدر کا رزلٹ آگیا اور وہ دن ماما کے بعد واحد دن تھا جب وہ دل سے خوش ہوئے تھے۔ بہت اچھے گریڈز کے ساتھ سی ایس ایس کلیئر کرنے کے بعد اگلا پڑاؤ انٹرویو کا تھا۔

ایک بار پھر خاندان بھر میں ہلچل مچ گئی۔ حیدر نقوی حیران کرنا جانتے تھے اور اس بار بھی انہوں نے اپنی کامیابی کا لیول برقرار رکھا تھا۔ لاہور میں ان کے دوستوں نے ایک بڑی پارٹی کی تھی جس میں ان کے پروفیسرز‘ دوستوں اور احباب کو بلایا گیا تھا۔ آگے کے مرحلے آسان تھے۔

اور اس کے بعد وہ ٹریننگ پر سول سروسز اکیڈمی چلے گئے۔ انہوں نے اپنے لیے فارن سروس کا انتخاب کیا تھا۔ اور یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ اس میں ماہا کی شادی کا ایشو خود بخود ٹھنڈا پڑ گیا۔

❀......❀......❀

کامیابی کا سفر ماں کی دعاؤں کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ ایک معروف جریدے میں حیدر نقوی کے انٹرویو والے ورق پر ان کی تصویر کے ساتھ یہ کیپشن تھا۔ یہ تین سال بعد کا ذکر تھا۔ یہ تصویر ایک عام انسان کی نہیں تھی۔ اب اس تصویر کے ساتھ ایک کامیاب بیوروکریٹ اور ایک فارن سرونٹ کا ٹیگ بھی لگا ہوا تھا۔

ایک ایسے انسان کی کہانی جسے زندگی میں سب کچھ پلیٹ میں رکھا نہیں ملا تھا جس نے ہر چیز کو پانے کے لیے

محنت اور جدوجہد کی تھی۔ اور ان کا قانع اور مطمئن چہرہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے ان کی زندگی خواہ وہ ذاتی تھی یا پیشہ ورانہ...... جنت کا نمونہ تھی۔

ہر چیز کو ہینڈل کر لینے کی مہارت اور وہ بھی اس قدر خوب صورتی سے کہ دیکھنے والا عش عش کر اٹھے۔ یہ سب کیوں کر ممکن ہوا تھا؟

بات پھر تین سال پیچھے جاتی ہی جب وہ ٹریننگ پر چلے گئے تو زینت خالہ نے زبردستی ماہا کی شادی کی ڈیٹ فکس کروالی تھی۔ اپنی اکلوتی بہن کی شادی میں شریک ہونے کا موقع انہیں مہمانوں کی طرح ملا جس پر وہ ازحد مضطرب تھے مگر بابا نے فوقی کے ساتھ مل کر سب سنبھال لیا تھا۔ اور ماہا کی شادی پر ہی بابا کو حیدر کے لیے کوئی پسند آ گیا۔ ان کی نظروں نے بڑی دور تک دیکھا اور سوچا تھا۔

ماہا کی شادی بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا گئی اور اس کے فوراً بعد بابا نے حیدر سے شادی کی بات کی تھی اور وہ جو آج کل ویسے ہی بہت مصروف تھے اکیڈمی میں، ان کی بات سن کر مضطرب ہو گئے تھے۔

''وہ بہت خاص ہے حیدر...... ڈبل ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ طور اطوار اتنے مودب اور شائستہ اور شکل وصورت بھی ماشاء اللہ ہے۔ تم ایک بار اس سے مل لو مجھے امید ہے تمہیں پسند آئے گی۔'' ان کا لہجہ پرسکون اور متوازن تھا۔ وہ چند لمحے بابا کو دیکھتے رہے۔ ثانیہ والے ایشو پر جہاں ماما تک انہیں سمجھنے میں ناکام ہو گئی تھیں، وہاں بابا نے ان کا ساتھ دیا تھا بلکہ ماما کو بھی کنونس کیا تھا تو اب وہ کیسے شک کرتے کہ بابا کی پسند میں کوئی خرابی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے سر جھکا دیا اور بابا کا سر ہمیشہ کے لیے اونچا کر دیا تھا اور یوں اجالا کریم ان کی زندگی کا حصہ بن گئی۔

❁......❁......❁

میں تیرے ذکر کے زنداں میں مقید ہو کر
اک دیوان سخن ایسا قلم بند کروں
جو سنے اس میں تیری دید کی خواہش جاگے
جو پڑھے تیری اسیری کے بہانے ڈھونڈے

(سال گرہ مبارک)

گلابی پھولوں والے ایک خوب صورت کارڈ پر درج اشعار اور ساتھ ایک گفٹ پیک۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے کارڈ ایک طرف رکھا اور گفٹ پیک کھول لیا۔ اس میں ایک سلور رسٹ واچ تھی۔ پھر انہیں یاد آیا کہ آج ان کی سال گرہ تھی۔

خوشی کا ایک گہرا احساس ان کے اندر اتر آیا۔ انہوں نے اردگرد نظریں دوڑائیں وہ دروازے کے فریم میں کسی تصویر کی مانند سجی انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ قدم بے ساختہ اس کی طرف اٹھ گئے۔

''تھینک یو...... اِٹس ویری نائس۔'' بہت ہلکا سا اظہار اور التفات کا مدھم سا اظہار۔ اجالا کے لبوں پر مسکراہٹ دھنک کی مانند پھیلی تھی۔ دونوں نے ایک لمحے کو ایک دوسرے کو دیکھا پھر بے ساختہ ہنسی...... حیدر نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اندر کی طرف کھینچ لیا۔

اجالا کی کھلکھلاہٹ سے کمرہ گونج اٹھا۔ پنک فراک میں دمکتی رنگت کے ساتھ اس کے سیاہ بال کسی آبشار کی صورت اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ لڑکی کیا تھی چلتی پھرتی کوئی پری معلوم ہوتی تھی۔ جانے کیسا جادو آتا تھا اس لڑکی کو جہاں دیکھتی کوئی چھڑی سی گھما دیتی، تارے سے جھڑتے اور سارا آسمان روشن ہو جاتا۔

جب وہ ان کی زندگی میں شامل ہوئی تھی تو حالات اتنے نارمل اور اچھے نہیں تھے۔ زینت خالہ نے ماہا اور وجاہت کی شادی ایک باقاعدہ سازش کے تحت کروائی تھی، وہ اس سانپ کی مانند تھیں جس کے تھیلیوں میں بہت سا زہر اکٹھا ہو چکا تھا اور اسے یہ زہر بہر صورت کسی کو ڈس کر باہر اگلنا تھا۔ اس کے لیے ایک بار پھر انہوں نے علی رضا اور زہرہ کے گھر کو چنا۔

زہرہ کی موت نے ان کے پلان کو شکست دے دی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ انہیں مزید خطرناک اور زہریلا بنا دیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو کبھی نہیں بدلتے

بس وقتاً فوقتاً اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔ انہوں نے بھی سانپ کی مانند کینچلی بدلی اور ماہا کا رشتہ ڈال دیا۔ پلان بہت واضح تھا۔ ماہا کی شادی کے بعد وہ بڑی آسانی سے اس پر دباؤ ڈال سکتی تھیں کہ وہ ثانیہ کے لیے حیدر کو منائے اور انکار کی صورت میں وجاہت' ماہا کو طلاق کی دھمکی دے دیتا' الغرض جیسا جال انہوں نے بنا تھا اس سے بچ نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔

مگر ایک بار پھر یہ زینت خاتون کی بدقسمتی رہی کہ وہ ناکام ہوگئیں۔ علی رضا نے اجالا کو حیدر کے لیے پسند کرلیا' وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی' دو دن میں بات بھی طے ہوگئی۔ زینت خالہ نے ماہا پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ وہ اپنے باپ کو اس رشتے سے روکے اور ان کے بہت مجبور کرنے پر جب اس نے روتے ہوئے گھر فون کیا تو نقوی ولا میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ سب کو سمجھ آ گئی کہ وہ سازش کا شکار ہوچکے تھے۔ مگر افسوس اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

ماہا پر دباؤ ڈالا جارہا تھا کہ وہ اس رشتے کو ختم کروائے مگر علی رضا نے اس کے بجائے حیدر اور اجالا کی شادی طے کردی۔ ان کے اٹھائے گئے اس قدم نے زینت خاتون کا غصہ اور طیش فزوں تر کردیا تھا۔ اور بات ماہا کی طلاق تک جا پہنچی۔ ایک طرف شادی کی تیاریاں' دوسری طرف بہن کی ٹینشن...... کچھ سمجھ نہ آیا تو علی رضا اور فوقی ماہا کو گھر لے آئے جنہیں وجاہت نے یہ کہہ کر رخصت کیا تھا کہ اب اگر وہ گئی تو واپس کبھی نہ آسکے گی مگر وہ آ گئی۔

شادی ہوگئی اور ماہا کے سسرال سے اس شادی میں کوئی شریک نہ ہوا بلکہ حیدر کے ننھیال میں سے کوئی شامل نہ تھا' کیسا عجیب واقعہ تھا کہ تاریخ گواہ ہے ننھیال ہمیشہ چھتر چھایا بنے رہتے ہیں ان کو یہ کیسا ننھیال ملا تھا جو ان کے سروں سے چھت تک چھیننے کے درپے تھا۔ معاملہ لٹک گیا۔ ماہا نے واپس جانے سے انکار کردیا اور دوسری طرف وجاہت پر اسے طلاق دینے کے حوالے سے دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔

ممکن تھا کہ یہ رشتہ ختم ہوجاتا مگر حیدر' وجاہت سے ملے اور بس ایک بار کا ملنا ہی ایسا سحر پھونک گیا کہ وجاہت اکیلا پوری فیملی کے آگے ڈٹ گیا کہ وہ کسی صورت ماہا کو نہیں چھوڑے گا اور نہ ہی وہ ان کی باتوں میں آ کر اپنا گھر خراب کرے گا۔

❀......❀......❀

یہ پنچائیت سید وجاہت نقوی کی درخواست پر بلائی گئی تھی۔ دونوں فریقین کے درمیان از حد تناؤ نظر آتا تھا اور اگر پنچائیت کے سرکردہ رکن اس قدر دباؤ نہ ڈالتے تو نقوی ولا سے ہرگز کوئی آنے کو تیار نہ تھا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہوگئے تو ایک رکن نے اٹھ کر مسئلہ بیان کرنا شروع کیا۔

"یہ پنچائیت سید وجاہت کے مطالبے پر بٹھائی گئی ہے۔ وجاہت نقوی کی زوجہ سیدہ ماہا بتول ایک گھریلو ناچاقی کی بنا پر اپنے والدین سید علی رضا نقوی اور سیدہ زہرہ کے گھر بھیج دی گئیں چونکہ معاملہ از حد بگڑ چکا ہے اس لیے نوبت طلاق تک آن پہنچی۔ مسلسل دو مہینوں سے سیدہ ماہا اپنے والدین کے ہاں مقیم ہیں۔ دوسری طرف سید وجاہت کے گھر والے کسی صورت یہ معاملہ حل نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ اس رشتے کو ختم کرنے پر تلے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں کی گئی۔ مگر معاملے کے اصل فریق سید وجاہت اس گھریلو سیاست میں پڑ کر اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہتے' اس لیے یہ پنچائیت دوسرے فریق کی رائے جاننا چاہتی ہے تاکہ معاملے کا حل نکالا جاسکے۔" سارا مجمع خاموش تھا۔ پھر سید علی رضا اٹھنے لگے' مگر حیدر نے ان کے ہاتھ پر دباؤ ڈال کر انہیں روکا اور خود اٹھ گئے۔

"ہم صلح کے لیے تیار ہیں' اپنی بیٹی کو بھیجنے کے لیے راضی ہیں مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ ایک نئی سازش کا تانا بانا نہیں ہے۔" ان کی آواز جاندار تھی۔ جس کے جواب میں سید وجاہت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں سید وجاہت نقوی آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میرے اس قدم میں قطعاً کوئی غلط مقصد شامل نہیں

ہے میں خلوص نیت سے یہاں آیا ہوں اور اس پیش قدمی کا مقصد صرف اور صرف اپنے گھر کو بربادی سے بچانا ہے۔ میں آپ سب کی موجودگی میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ماہا اب میری ذمہ داری ہے اور اگر آپ کو کوئی بھی شکایت ہوئی تو اس کا صرف اور صرف میں ذمہ دار ہوں گا۔ میں اپنی فیملی کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ بہرحال اب وہ میری زندگی میں مداخلت نہیں کریں گے۔'' اس کا لہجہ مضبوط اور مستحکم تھا اور پہلی دفعہ اس میں ایک حقیقی پولیس آفیسر نظر آیا تھا۔ بارعب اور فیصلہ کن' دوسروں کی پروا نہ کرنے والا۔

''نقوی ولا'' کی طرف سے خوش دلی سے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا اور یوں فراخ دلی سے جو کہ نقوی ولا کا خاصہ تھی ماہا نقوی کو شخصی ضمانت پر سید وجاہت کے سپرد کردیا گیا۔

اس دنیا میں اگر اچھے کے ساتھ اچھا اور برے کے ساتھ برا ہونا بند ہوجائے تو شاید ہمارا اعتبار انسانیت سے اٹھ جائے۔ لوگ کس طرح امید رکھتے ہیں کہ دوسروں کے راستے میں کانٹے بو کر خود کہکشاں پر قدم دھریں گے؟ زینت خالہ اس ساری سازش کے ماسٹر مائنڈ اور ان کی رائٹ ہینڈ امینہ خالہ دونوں نے اپنے کیے کا پھل کھایا ہے۔ زینت خالہ کو وجاہت پر بڑا فخر تھا کہ وہ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی تھا۔ وہ اسے جیسے چاہیں استعمال کرسکتی تھیں۔ اس نے ساری برادری کو اکٹھا کرکے وہ جوتا مارا تھا ان کے منہ پر کہ وہ زخمی ناگن بن گئی تھیں۔ دوسری طرف امینہ خالہ تھیں جن کو نہ اولاد سے سکون تھا نہ گھر سے' شوہر عجیب غلط دھندوں میں پڑے ہوئے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ جب وجاہت' ماہا کو لے کر گھر گیا تو وہ اس شکست کو برداشت نہ کرپائیں اور ثانیہ کو لے کر گھر چھوڑ گئیں۔

کتنا تضاد تھا ان کے آغاز اور انجام میں۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ ہر صورت نقوی ولا کو برباد کردیں اور اس کے لیے ان کی کی گئی ساری غلط کوششیں ان کے اپنے گلے پڑ گئی تھیں' وہ جو ماہا کو گھر سے نکالنا چاہتی تھیں' اب خود دربدر تھیں۔ دنیا مکافات عمل کی جگہ ہے۔

❁......❁......❁

یہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے اندر کا منظر تھا۔ جہاں دو نفوس ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔ دونوں کے چہروں پر تناؤ تھا۔ چونکہ وہ ایک لمبی بحث کرچکے تھے اور موضوع بھی ایسا دل خراش تھا کہ ساری اذیت اور درد جیسے دوبارہ زندہ ہوگئے تھے اور بالآخر انہوں نے لب کھولے' کچھ آخری کلمات کہنے کے لیے۔

''اگر ہمارا گھرانہ کامیاب ہے' ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں تو کیا اس کی سزا دو گے ہمیں؟ تمہیں میری بہن میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی کیا یہ قصور ہے اس کا' جس کی بنا پر تم اسے چھوڑنا چاہتے ہو؟ ہمارا آشیانہ بکھرا...... ماما چلی گئیں' کیا اب بھی سب کے دلوں میں نفرت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی؟ کیا ہماری سادگی ہمارا جرم ہے؟ کیا دوسروں پر یقین کرنا گناہ ہے' جیسا میرے بابا نے تم لوگوں پر کیا..... کیا اس کی سزا دو گے ہمیں؟ اگر تمہیں پتا چل جائے کہ میرے دل میں رویوں کی بدصورتی کے کتنے سوراخ ہیں تو تم حیرت زدہ رہ جاؤ کہ میں زندہ کیسے ہوں؟'' وہ اپنی بات مکمل کرکے پرسکون انداز میں اٹھے اور واپسی کے لیے مڑ گئے۔ اور وجاہت نقوی کو جیسے زندہ قبر میں دفن کرگئے۔

❁......❁......❁

''ہمارا بہت چھوٹا سا گھرانہ ہے' بابا ہیں جو اپنی جاب کرتے ہیں آپ کو اپنی بیٹی سے زیادہ عزت اور پیار دیں گے۔ ماہا میری اکلوتی بہن ہے' میں چاہوں گا آپ اسے اپنی بہن سمجھیں۔ مجھے اس سے خوشی ہوگی' ایک چھوٹا بھائی ہے فرقان' جس کا آپ کو چھوٹے بھائی کی طرح خیال رکھنا ہوگا۔ اجالا' یہ شادی میں نے اپنے بابا کی پسند سے کی ہے اس یقین کے ساتھ کہ ان کا فیصلہ یقیناً بہت بہترین ہوگا۔ میں آج شادی کے پہلے دن آپ سے کوئی بہت زیادہ عہد و پیمان نہیں باندھوں گا۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ

میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ آپ کو خوش رکھ سکوں' ہوسکتا ہے میں آپ کو بہت سی آسائشات نہ دے سکوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی کرائسس بھی آجائیں...... مگر میں آپ کو اس چیز کا یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو میری ذات سے کوئی دکھ نہیں ملے گا۔ آپ آج سے میری زندگی کی ساتھی ہیں۔ جس کے ساتھ میں اپنی ذات' احساسات اور جذبات شیئر کروں گا' ہوسکتا ہے آپ کو کوئی چیز مجھ میں اچھی نہ لگے' یا مجھے کچھ ایسا مسئلہ ہو مگر میں چاہوں گا کہ ہم اسے مل بیٹھ کر سلجھائیں اور انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا' میں آپ کو آپ کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کی ساتھ اپناتا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ ہمیشہ ہمارے درمیان باہمی عزت اور احترام کا رشتہ قائم رہے۔'' اجالا صرف سر جھکائے سنتی رہی تھی۔ وہ پہلے لمحے ہی جان گئی تھی کہ وہ قسمت کی دھنی نکلی تھی۔ اس کے نصیب میں جو مرد آیا تھا وہ عام مردوں سے بہت مختلف تھا' اس کی سوچ بڑی پاکیزہ اور صاف تھی۔

آنے والے دنوں میں انہوں نے اپنی کہی ہر بات کو پورا کیا تھا۔ ان کی ہم آہنگی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اجالا...... ان کی روشنی...... جس نے ان کے دل سے لے کر ان کے گھر کو اپنے اجالوں سے منور کردیا تھا۔ جس نے انہیں ایک بار پھر ماما سے ملادیا تھا' وہ ماما کی طرح ان کو سمجھتی' ان کا خیال رکھتی' ایک پروانے کی مانند ان سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور جسے دیکھ کر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے کہ وہ یقیناً ان کے لیے اللہ کا انعام تھی۔

اور جس کی گھٹاؤں جیسی زلفیں کیسی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں تھی ان کے لیے' کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔ بہت سالوں بعد آخر زندگی نے انہیں اس گرداب سے باہر نکال دیا تھا جس میں وہ گزشتہ کئی سالوں سے پھنسے ہوئے تھے۔

ماما اور وجاہت آپس میں بہت خوش تھے۔ زینت خالہ ثانیہ کے ساتھ گھر چھوڑ کر الگ گھر میں چلی گئی تھیں۔

❀......❀......❀

حیدر نے لیپ ٹاپ پر کام کرتے کرتے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو ہاتھ میں ٹرے تھامے اندر آرہی تھی۔ دونوں کی نظروں کا خاموش تبادلہ ہوا اور ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ بے اختیار آئی تھی۔ کتنی پیاری عادات تھیں اس کی' بات کو بہت جلد سمجھ جاتی اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں کبھی بتانا نہ پڑا تھا' وہ ان کو بڑی جلدی جان گئی تھی' انہیں کیا پسند یا ناپسند' ان کی سوچ' خیالات' عادات اور مزاج ہر چیز کو جیسے اس نے گھول کر پی لیا تھا۔

جتنے مسائل ان کی شادی میں پیش آئے تھے سارا خاندان اس بات کا منتظر تھا کہ وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی معمولی سی بھی چپقلش کا تماشا بنائیں اور اجالا سے ان کی شادی کے فیصلے کو غلط ثابت کریں۔ مگر ان دونوں کے باہمی سلوک' محبت اور ہم آہنگی نے ان کی سب امیدوں پر اور مذموم عزائم پر پانی پھیر دیا تھا۔

پتا نہیں انسان کب دوسروں کے گھروں میں تانکا جھانکی کر کے چسکا لینا چھوڑے گا؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دین نے بھی اس سے منع کیا ہے مگر اس کے باوجود ہم اپنی ان چھوٹی چھوٹی خطاؤں سے باز نہیں آتے

جو کہ کل کو بڑھ کر گناہوں کی شکل اختیار کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

''اور آپس میں تجسس نہ کرو اور نہ حسد کرو۔''

(القرآن)

مگر آج بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ایسا سوچتے ہیں۔ دوسری طرف کسی دوسرے کی جائیداد پر قبضہ جمانا جو کہ ہم نے اس قدر آسان سمجھ لیا ہے اور جس کے لیے دوسروں کا قتل تک کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا اور جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے۔

''جس کسی نے کسی دوسرے کی زمین پر ناجائز قبضہ کیا اسے قیامت کے روز سات زمینوں تک دھنسایا جائے گا۔''

(الحدیث)

آج والدین اگر بچوں کی پسند کو ترجیح دیں تو ماڈرن ازم کی چھاپ لگادی جاتی ہے جب کہ اس چیز کی آزادی خود اسلام نے دی ہے کہ بچوں کی پسند کے بغیر شادی نہ کی جائے' کم از کم رضامندی لینا ہر حال میں لازم قرار دیا گیا۔

❁ ❁ ❁

حیدر کی پوسٹنگ ترکی کردی گئی تھی۔ آج وہ جانے سے پہلے ماما کی لحد پر آئے تھے۔

ان کی آنکھیں آج اتنے سالوں بعد بھی نم تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح گلاب کی پتیوں سے قبر کو ڈھکا اور درمیان میں گلاب چن دیئے اور فاتحہ خوانی کے بعد وہیں بیٹھ گئے۔ پھر ایک ہاتھ یوں پھیلا لیا جیسے ان کا شانہ ہو۔

''آپ کی بہت یاد آتی ہے ماما' آج آپ ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں' میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کی روح کو سکون اور خوشی دے۔ آپ کو پتا ہے وہ لڑکی اجالا...... وہ بالکل آپ جیسی ہے وہ بہت پیاری' بہت خاص' بہت نایاب' اس نے آکر مجھے سمیٹ لیا ہے۔ وہ میری آنکھوں کی روشنی بن گئی ہے اور میرے دل کا نور۔'' وہ زیر لب یوں بات کررہے تھے جیسے سچ مچ ماما سے مخاطب ہوں۔ اسی وقت ان کا فون بج اٹھا۔

''اجالا کالنگ'' کے الفاظ چمک رہے تھے۔ وہ ایک نئی توانائی محسوس کرکے اٹھے۔ ان کی روشنی انہیں پکار رہی تھی۔ اب منزل قریب تھی اور راہیں روشن!

وہ ایک لڑکی کہ جس کا نام اجالا تھا اس نے اپنے دست شفا سے ان کے سارے درد چن لیے تھے۔ وہ بڑے مختلف' بڑے آئیڈلسٹ انسان تھے' ان کی ذہنی اپروچ دوسرے انسانوں سے بڑی مختلف تھی۔ ان کی بلند نظریں' اور دریا دلی ان میں ان کی ماما کی ودیعت کردہ تھی اور اجالا کریم وہ لڑکی تھی جس نے اس ٹوٹے بکھرے آشیانے کو جوڑا تھا' بلکہ حیدر کی زبانی' زہرہ بتول کی شخصیت کے بارے میں جان کر وہ روحانی طور پر ان سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور کہیں اندر ہی اندر یہ خواہش بھی جاگی تھی کہ کاش آج وہ زندہ ہوتیں۔

مگر یہی نوشتہ تقدیر تھا شاید!!

بہت دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ حیدر گم صم آرام کرسی پر جھول رہے ہوتے تو وہ نرمی سے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتی اور سوال کرتی۔

''ماما یاد آرہی ہیں؟'' اور جواباً حیدر سر ہلا کر ان سے ماما کی کوئی بات شروع کردیتے جسے وہ اتنے غور اور دلچسپی سے سنتی کہ ان کا کتھارسس بڑی خوب صورتی سے ہوجاتا۔

اور وہ بڑے فخر سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دیکھ کر سوچتے کہ اگر ان کی زندگی میں یہ دست شفا نہ ہوتا تو ان کا کیا ہوتا؟

مگر کچھ انعام شاید اس دنیا میں بھی مل جاتے ہیں۔ جیسا کہ حیدر کے لیے اجالا!!

کہ اس کے لمس مسیحا نے چن لیے تھے درد سارے!!

❁